نظریۂ حیات کی تشکیل نو

● ——— اسلم صدیقی

جناب اسلم صدیقی صاحب کی کتاب A PATH FOR PAKISTAN کا ایک باب بعنوان RECONSTRUCTION OF IDEOLOGY ہے۔ اس باب کے اردو ترجمہ کی یہ دوسری قسط ہے۔ آئندہ اشاعت میں یہ ترجمہ مکمل ہو جائے گا۔ یہ کتاب عنقریب اردو میں شائع ہو رہی ہے۔ مترجم: محمد سرور

مذہبی فکر کا ارتقاء شروع کی پانچ صدیوں کے دوران اسلام کے مذہبی فکر میں جو ارتقاء ہوا، اگر اسے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس سے بعض نتائج آسانی سے نکالے جا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے جتنے بھی فرقے ہیں، وہ تاریخی قوتوں کے ردّ عمل کا نتیجہ ہیں۔ وہ یا تو میدان جنگ کے جوش و خروش میں یا کسی دوسرے فرقے کے ردّ عمل کے طور پر پیدا ہوئے۔ اس ردّ عمل نے قدرتی طور پر یا تو کھلم کھلا بغاوت کی شکل اختیار کی، جیسا کہ خوارج کے معاملے میں ہوا۔ یا یہ تخریبی سرگرمیوں میں منتج ہوا، جیسا کہ شیعوں کا معاملہ تھا۔ حالات ایسے تھے کہ متوازن اور معقول طریقہ کار ناممکن تھا۔ اس زمانے میں جنگ کے معنی ہمہ جہتی جنگ کے تھے اور دشمن کو پوری طرح نیست و نابود کرنا ہوتا تھا۔ مسلمانوں میں بھی اوروں کی طرح اُس زمانے کا یہ جذبہ سرایت کئے ہوئے تھا۔ آپس کے اختلافات جو بظاہر مذہب پر مبنی ہوتے، انہیں بھڑکا کر اس درجے پر لے جایا جاتا کہ ایک گروہ یا دوسرے گروہ کا کلی استیصال ناگزیر ہو جاتا۔ ان حالات میں تحفظ ذات کا مسئلہ بڑا اہم تھا اور قدرتی بات تھی کہ یہ ذہنی اور جسمانی اجتماعیت میں منتج ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے بتدریج جماعتی مسلک کی بڑی سختی سے پابندی کا طریقہ کار ایجاد کر لیا جو مسخ ہو کر اندھا دھند تعصب کا رنگ اختیار کر گیا۔ غرض مسلمان "امۃ وسطاً" نہ رہے۔ عقلیت کو ختم کرنے کے بعد وہ مخلصانہ اختلاف رائے کی قدر و قیمت کو محسوس نہ کر سکتے تھے، اسے کچل دیا گیا اور اس پر بحث کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

مذہبی فرقے عام طور پر سیاسی اغراض کے تحت وجود میں آئے۔ ان کے سامنے چند معین مقاصد تھے، جنہیں ان کو حاصل کرنا تھا۔ ہر فرقے نے انتہا پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا۔ اور یوں ایک یا اس کے مخالف فرقے کا استیصال لابد ہو گیا۔ اندھا دھند تعصب اس صورت حال کا لازمی نتیجہ تھا۔ سُنی مسلک، جو اپنی اصل میں آزاد خیالی کی ایک تحریک تھی اور جس کا مقصود مذہب اور سیاسی و معاشرتی بحثوں میں توازن اور سلامت روی کو بحال کرنا تھا، کچھ عرصے کے بعد اپنا یہ کردار کھو بیٹھا۔ سنی مسلک بھی ایک حزب بن گیا اور تعصب کے زیر اثر آگیا۔ یہ ردِ عمل تھا شیعیت کے خلاف، جو شروع میں تو بے شک ایک روشن خیال حزب مخالف کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن وقت گزرنے کے بعد وہ تخریب پسند ہو گئی۔ تاتاریوں کے حملے کے دوران بعض شیعوں کا کردار قابل اعتراض رہا۔ بہر حال جو کچھ ہوا، ہوا۔ اب تو اس تعصب کو ختم کرنا اور اسلامی راسخ العقیدگی میں آزاد خیالی کو ایک حد تک داخل کرنا ہے تاکہ مذہبی امور میں متوازن غور و فکر کا امکان پیدا ہو سکے۔

مذہبی فرقے اور اُن کی افادیت

ہر نئے فرقے کا بانی عام طور سے یہ طریقہ اختیار کرتا کہ وہ قرآن کی تفسیر لکھتا اور "فائدہ مند" بلکہ موضوع بھی حدیثیں جمع کرتا۔ حدیث کو پروپیگنڈے کا زبردست واسطہ بنا لیا گیا۔ نئے فرقوں کے بانی اپنے عہدوں کے واقعات و حالات اور معاشرتی مسائل کو پیچھے کی طرف رسول اللہ صلعم کے زمانے میں لے جاتے اور پھر وہ کچھ حدیثوں کا "انکشاف" کر لیتے، جو معاشرے کو ایک مخصوص مطلوبہ طریقے پر تشکیل دینے میں مددگار ہو سکیں"۔ رسول اللہ صلعم کے اسوہ پر مسلمانوں کی اوّلیں نسلوں نے جس طرح عمل کیا، حدیث اس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ دراصل مجموعہ ہے جوامع الکلم کا، جنہیں خود مسلمانوں نے مرتب کیا۔ اور ظاہراً طور سے یہ رسول اللہ صلعم کے ہیں اگرچہ آپؐ سے ان کا تاریخی تعلق بھی ثابت ہے۔ حدیث گویا رسول اللہ صلعم کی شخصیت کی ایک عظیم الشان اور یادگار تفسیر ہے۔ یہ عبارت ہے عہد اوّل کے مسلمانوں کی دانائی کے لب لباب سے"[۱۴] مسلمانوں نے اپنی ان قابل تعریف کوششوں کے ضمن میں دینی ادب میں ایسی چیزوں کا اضافہ کر لیا، جو زمان و مکان کے اعتبار سے حد سے زیادہ مقامی نوعیت کی تھیں۔ اس طرح کی چیزیں جلد ہی اپنی معنویت کھو بیٹھیں اور بوجھ بن کر رہ گئیں۔ جو بھی حدیثیں اس وقت ملتی ہیں، ان میں کافی بے تعلق باتیں بھی مخلوط ہو گئی ہیں۔

---

[۱۴] ڈاکٹر فضل الرحمٰن، اسلامک سٹیڈیز بابت جون ۱۹۶۲ء

تمام فرقے جو شروع میں اپنے مقاصد کے بارے میں اچھے خیالات رکھتے او مخلص تھے۔ تاریخی طاقتوں اور سیاسی دباؤں کے زیر اثر آئے، جنہوں نے ان کو قابل اعتراض طریقے اور عقائد اپنانے پر مجبور کر دیا۔ ان فرقوں کا سب سے بڑا اساس حدیثیں بنیں۔ بعض مخصوص حالات میں تو یہ فرقہ وارانہ نظام بامعنی تھے۔ لیکن اپنے تاریخی سیاق وسباق سے باہر ان کے کوئی معنی نہیں رہتے ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ چند مخصوص سیاسی اور معاشرتی امور کو اسلامی دینیات کی اصطلاحات میں حل کرنے کی کوششیں ہیں اور یہ بعض مخصوص قسم کے مسائل سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے، اُن کی واضح مثالیں ہیں۔ آج کے بدلے ہوئے حالات میں حدیث کو اس میں جو وقتی و مقامی باتیں شامل ہیں، پاک کرنا اور اس کی حقیقی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا تعین کرنا ہوگا۔

ترقی و انحطاط اب اس پر عمل کرنے کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ ایک تحریک یا انقلاب کس طرح ارتقاء پذیر ہوتا ہے اور پھر کیسے انحطاط کی راہ اختیار کرتا ہے، اسے سمجھا جائے۔ نئی تحریکیں اپنے اندر شامل ہونے والوں اور پیروؤں کو ایک بلند تر وفاداری کی تلقین کرتی ہیں اور وہ اتحاد اور نظم وضبط کی بدولت ہی اقتدار حاصل کرتے ہیں اس سلسلے میں ان کے ہاں ایسی روایات پیدا ہو جاتی ہیں، جو ان کی جمعیت کو اکٹھا رکھتی ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ روایات زمان و مکان کے ساتھ ساتھ نہیں چل پاتیں۔ ان حالات میں ان کے ہاں تجدید کرنے والے پیدا ہوتے ہیں، جو دونوں میں مطابقت چاہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ آزادئ فکر اور سخت قسم کی تنقید کا آغاز کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں روایت پرست ہمیشہ طاقت استعمال کرتے ہیں اور اس طرح وہ جبر و تشدد کے طریقوں سے اپنا اقتدار بحال رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کش مکش میں بلند تر وفاداری ختم ہو جاتی ہے۔ شخصی ہوس کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اچھی باتوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور بدی فروغ پاتی ہے۔ معاشرتی تنظیم ٹوٹ جاتی ہے اور وہ کسی قسم کے اخلاقی معیاروں کو نافذ کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ طاقت اور صرف طاقت کی عزت کی جاتی ہے۔ مستعد و قابل افراد ایمانداری اور اخلاقی ذرائع سے آگے بڑھنے کی راہ اپنے سامنے بند پاتے ہیں۔ اس طرح ان کا مروجہ معاشرتی نظام سے تصادم ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ناپائیدار ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی یہ ناپائیداری یا تو کسی انقلاب سے دُور ہوتی ہے یا کوئی غیر ملکی حملہ آور اسے دُور کرتا ہے۔

تاریخ اسلام میں ایسی بہت زیادہ بغاوتیں ہوئی ہیں، جن کی کوشش یہ تھی کہ وہ سیاسی انقلاب لائیں۔ جب خون خرابے کے طریقوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا تو نظریاتی انقلابات یعنی نئے مذہبی فرقوں کی تشکیل کی ابتدا ہوئی۔ اس طرح کی کوششوں میں بھی ایک فرقے کے مقابلے میں دوسرا فرقہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آخر میں غیر ملکی حملہ آور آئے اور

انھوں نے ہر چیز کا صفایا کر دیا۔ انہیں اُن مسلمان گروہوں سے، جو نارا من تھے، مدد ملی۔ لیکن اس سلسلے میں یہ ضرور ہوا کہ جہاں مسلمان ناکام ہوئے، وہاں اسلام کامیاب رہا۔ بعض غیر ملکی حملہ آور خود اسلام لے آئے۔

غور و تفکر کا عمل تاریخ اسلام کے طویل عرصے میں جو مذہبی فرقے وجود میں آئے، ان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ دراصل تلوار کے بجائے دوسرے ذرائع سے انقلابات لانے کی کوششیں تھیں۔ لیکن ان فرقوں کے جو معتقدات تھے ان سے کہیں زیادہ اہم وہ سوالات ہیں، جن کا ان فرقوں نے اپنے اپنے زمانے میں جواب دینے کی کوشش کی۔ ضروری تھا کہ ان کو اپنے علم، اپنے زمانے اور اپنے سیاسی ماحول کے محدود ہونے کی بناء پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا اور وہ پیش آمدہ سوالات کے صحیح جوابات نہ دے سکتے۔ لیکن آج یہ ممکن ہے کہ ان سوالات کے زیادہ صحیح اور مناسب جوابات مل جائیں۔ فی الحقیقت ان فرقوں کے اصل معتقدات کے مطالعہ سے کہیں زیادہ مفید انھوں نے اپنے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے غور و تفکر کا جو طریقہ اختیار کیا۔ اس کا مطالعہ ہے۔

نظریہ حیات کی تشکیل نو کا جو چیلنج اس وقت ہمیں درپیش ہے، اس کا جواب موجودہ حالات میں انہی سوالات کو زیادہ تفصیل اور زیادہ وضاحت سے از سرِ نو متعین کر کے اور ان کے جوابات پانے کے لئے اسلامی عمل تفکر کو بروئے کار لا کے دیا جا سکتا ہے۔ طاقت کا استعمال، خواہ وہ کھلم کھلا ہو یا در پردہ، مسائل کو الجھاتا ہی ہے۔ یہ ایک مستقل چیلنج ہے، جس کا اسلام کو لازماً مقابلہ کرنا ہے۔

نظریہ حیات کی تشکیل نو اس بارے میں بنیادی مقصد یہ ہے اسلام کی اصل فطرت میں جو حرکیت و فعالیت ہے، وہ بحال کی جائے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو غور و فکر کی نئی عادت اور حقیقت کو جانچنے کا نیا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ قرآن میں بار بار تاریخی واقعات سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طریقے پر ان غلطیوں کو جو تاریخی تناظر اور زیر موضوع مسائل کو پوری طرح ادراک کرنے کی کمی کی وجہ سے واقع ہوئیں، ٹھیک کرنے کے متعلق عمل کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو اپنے تاریخی تنقید کے طریقوں کو دوبارہ زندہ کرنا اور اسلامی ورثے کے مختلف عناصر کی حقیقی قدر و قیمت کو جانچنا ہوگا۔

مسلمانوں کے فرقوں سے اسلام کی صحیح تعبیر میں صرف اسی طرح رہنمائی مل سکتی ہے اگر ان کو تاریخ کے صحیح تناظر میں رکھا جائے اور مقامی زائد چیزوں سے ان کی اصل حقیقت کو الگ کیا جائے۔ موجودہ شکل میں تو یہ فرقے اس کام کے لئے کار آمد نہیں ہو سکتے۔ توحید کے اصول کی روشن پیشانی پر بہت کچھ بت پرستی کا دھبا لگا ہوا ہے اور اسلام کے اخلاقی نصب العینوں کا عالمی اور غیر شخصی کردار مقامیت کے زیر اثر مفقود ہو گیا ہے۔ اب ہمارے سامنے بس ایک ہی راہ کھلی ہے کہ ہم اسلام کے

اردگرد سے اس سخت خول کو اتار دیں جس نے زندگی کے بارے میں بالخصوص اسلام کے حرکی نقطۂ نظر کو جامد بنا دیا ہے۔ اور اس کی آزادی، مساوات اور اتحاد و سالمیت کی اصل سچائیوں کو از سرِ نو دریافت کر کے ان کی اصل سادگی اور عالمگیریت پر اپنی اخلاقی، معاشرتی، اور سیاسی مثالی قدروں کی تشکیل نو کریں"[15] اس قسم کے طریقۂ کار کو راسخ العقیدگی کی بعض مخصوص چیزوں پر آج زور دینے کی جو ضرورت ہے، اس کی حقیقی قدر و قیمت کو جانچنے اور راسخ العقیدگی کو اُن خطوط پر نئی ترتیب دینے میں مدد دینی چاہیئے، جن کا کہ اسلام اور عہد حاضر کی روح تقاضا کرتی ہے۔

مفاہمت کے عقائد | سیاسی اسباب کی بناء پر بعض عقائد" دریافت "کر لئے گئے تھے اور ان پر بہت زیادہ زور بھی دیا گیا۔ یہ عقیدہ کہ انسان فاعل مختار نہیں، اصل میں خارجیوں نے جہاد پر جو بہت زور دیا تھا۔ اس کے توڑ کے لئے تھا۔ حسن بصری سے مروی ہے کہ انہیں اس عقیدۂ جبر کی تائید میں کوئی حدیث نہیں ملی۔ بعد ازاں اس کے متعلق کثیر التعداد حدیثیں نکل آئیں اور یہ صورت حال سرتاسر انفعالیت پیدا کرنے میں ممد و معاون بنی۔ اسی طرح جب امت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تو اسے دبانے کے لئے ایک منظم حکومت کے حق میں بہت کچھ کہا گیا۔ اس مطالبے نے آگے چل کر اس عقیدے کی شکل اختیار کر لی کہ سلطان ظل اللہ ہے۔ اور اس کی وجہ سے شخصی حکومت کو جو اس طرح بڑھایا چڑھایا گیا، تو اس سے امت کے حقوق پر زد پڑی۔ عثمانی ترکوں کو اس طرح کے غلط رویّوں کا بہت خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اور انھوں نے ان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔ ان کے ایک مفکر نامق کمال نے مسلمانوں میں بیعت کا جو تصور ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمراں اُمت سے مشورہ کرنے پر مجبور ہے اور وہ اپنے اعمال کا اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ نامق کمال کے نزدیک اسلامی نظریے کی رُو سے پہلا عہد انسانوں کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک انسان اور خدا کے درمیان ہے۔ اس کے بعد وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ "امامت کا حق اُمت کو ہے اور لوگ جمع ہو کر ایک امام کو معزول اور دوسرے کو مقرر کر سکتے ہیں"[16] افسوس! اس حقیقت کا احساس بہت دیر میں ہوا۔

غرضیکہ تاریخ کے دوران اس طرح مفاہمت و مصالحت کے جو عقائد وجود میں آئے، وہ جن فوری مقاصد

---

[15] علامہ اقبال کی تصنیف RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT. میں سعید حلیم پاشا کا حوالہ ص ۱۵۶

[16] SERIF MARDIN کی تصنیف The genesis of young ottoman thought.

کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئے تھے، ان حدود سے بہت آگے بڑھ گئے اور مسلمان یہ بھول گئے کہ ایک عام آدمی پر ایک چیز کا اثر جزوی کے بجائے کلی ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخی ضرورتوں کے ماتحت انھوں نے جو مفاہمتیں کی تھیں، وہ اس طرح خود بخود راسخ العقیدگی کے مستقل اجزا بن گئیں۔ اور اس قسم کے ترکیب شدہ عقائد کے ساتھ جو شرطیں لگی ہوئی تھیں، ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔ دینیاتی، اخلاقی اور سیاسی میدانوں میں بعض مخصوص نقطہ ہائے نظر نے آج جو انتہا پسندانہ اور ہمہ جہتی نفوذ پذیر رویّہ اپنا رکھا ہے، وہ عام طور سے اصل ترکیب شدہ عقیدے سے مطابق نہیں۔ بے شک خاص حالات میں ان عقائد نے ایک مقصد پورا کیا، لیکن بعد میں وہ بے کار ہو کر رہ گئے۔ اور ان پر جو غلط زور دیا گیا تو یہ بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔ اس قسم کے نقطہ ہائے نظر کو لازماً کانٹ چھانٹ کر ان کے اصلی مقام پر لانا چاہیئے۔

براہ راست ذہنی ربط اس امر پر بھی زور دینے کی ضرورت ہے کہ غور و تفکر کے عمل اور واقعات کے ظہور پذیر ہونے میں ایک منطقی حقیقت ہے۔ جو الفاظ اور متون میں جو کچھ قلمبند کیا گیا ہے، اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ الفاظ مردہ ہو جاتے ہیں، طریقہ ہائے فکر زندہ رہتے ہیں، بلکہ بدلے ہوئے حالات میں الفاظ گمراہ بھی کرتے ہیں۔ قرآن اصول و مبادی پیش کرتا ہے اور سنت ان کی عملی مثال ہے۔ معذرت خواہانہ انداز میں اسلام کی مدافعت کرنے والوں اور اسلام کو بطور ایک نظری نصب العین ماننے والوں دونوں نے پورا سچ اور صرف سچ نہ بتا کر اسلام کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ان کا صرف اچھی اچھی باتوں کو منتخب کر لینا اور ان کی نظریہ پرستی۔ انھوں نے ان کے نقطۂ نظر کو راہ راست سے ہٹا دیا اور اس طرح اُمت تاریخ سے پوری طرح فائدہ اٹھانے سے محروم ہو گئی۔

دینیات کی تعلیم کے موجودہ طریقے کو بنیادی طور پر تبدیل کرنا چاہیئے۔ طالب علموں پر کتابوں کا بوجھ جو صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ اور بڑی بڑی شخصیتوں کی طرف منسوب ہیں، لاد دیا جاتا ہے۔ یہ طالب علموں میں جو کچھ بھی تخلیق و اختراع کی صلاحیت ہوتی ہے، اسے ختم کر دیتی ہیں۔ طالب علموں کو ہر چیز بلا کیف مان لینے کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس طرح ان کے اندر جستجو کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ دور از کار اور فرسودہ دعاوی پر تنقید نہیں کرتے اور اس طرح ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ عہد ماضی کے عظیم اہل علم کے افکار کو عہد حاضر کے حالات کے ساتھ مطابقت دینے کی کوشش کریں۔ غرض یہ پوری کی پوری تعلیمی سرگرمیاں چونکہ زندگی سے بے تعلق ہیں، اس لئے ان میں کوئی زندگی نہیں۔ اُس نے اُمت کو مُرجھا دیا ہے۔

زندگی کے ناپختہ عمل پر منطقی طریقوں کا اطلاق ایک خاص حد تک ہی مفید ہوتا ہے۔ اس حد سے آگے یہ منطقی طریقے

ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ ایک فوری اور اہم ضرورت ہے کہ وہ قرآن کے غور و تفکر کے انداز سے براہ راست ذہنی ربط پیدا کریں اور اس کی روح کو اپنے اندر سموئیں۔ اس کے سوا خود کو تعلیم و تربیت دینے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ سنت کے بارے میں معذرت خواہی اور اُس کے کسی حصے کی غلط تعبیر کرنے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں۔ یہ عمل صحیح طرح ادراک کرنے اور بصیرت کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے، جو مشکلات پیدا کرتا ہے۔ اصل ضرورت چیزوں کو اپنے تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں رکھنا ہے، پھر کہیں جا کر وہ بامعنی اور بامقصد بنتی ہیں۔

داخلی سیر حاصل زندگی قرآن اور سنت سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ روحانی، دینوی اور ذہنی استعداد کے ساتھ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ حادثات و واقعات کی دنیا بہترین معلم ہوتی ہے اور وہ لوگ جو خود زندگی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، ان کے لئے قرآن کو سمجھنے کے لئے ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر موقع ہوتا ہے، جو الفاظ اور عبارت میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں " اگر انسان خود پہل نہیں کرتا، اگر وہ اپنی ذات کی داخلی صلاحیتوں کو ترقی نہیں دیتا اور اگر وہ آگے بڑھتی ہوئی زندگی کی باطنی رَو کو محسوس کرنے سے قاصر رہتا ہے، تو پھر اس کے اندر کی روح سخت ہو جاتی ہے اور وہ بے جان مادے کی سطح پر پہنچ جاتا ہے لیکن اس کی زندگی اور اس کی روح کی باطنی رفتار ترقی کا انحصار اس حقیقت سے جس کا کہ اسے سامنا کرنا پڑتا ہے، تعلقات استوار رکھنے پر ہے اور یہ علم ہے، جو ان تعلقات کو استوار کرتا ہے۔ اور علم عبارت ہے حسّ ادراک سے جسے عقل اور سمجھ وسعت عطا کرتی ہے"[۷۱] مسلمان زندگی سے اپنا تعلق چھوڑ بیٹھے اور اس لئے باطنی زندگی کی ثروت اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہو گئے۔ (باقی)

---

[۷۱] علامہ اقبال تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ صد ۱۳